ڈاکٹر صفیہ عباد*

رشید امجد کا نیا افسانوی مجموعہ۔ "دکھ ایک چڑیا ہے"

(مطالعہ و تجزیہ)

Abstract: *A new book of Rashid Amjad's short stories which stands upon the platform of present time, past and future as usual, but the changing of time, trends, new aspects of human behavior, relations and breaking up the family system rapidly is a new dimension of his literary work. Almost every story depicts the deepest sorrow, unbelievable loneliness, sense of losing everything at every step. All these aspects are connected with the actual philosophy of life.*

The stories portrays the vast experience, feelings, emotions and the lonely circle of writer's inner self which is a new colour of writer's autobiography.

The concept of life and death which is the combination of faith, spirituality with a new scientific point of view is being shaped up in these stories.

رشید امجد اُردو افسانے کا ایک نمایاں ترین نام ہے۔ جن کی کہانی نے تقریباً چھ دہائیوں سے اپنے عہد اور معاشرے کے ہر بدلتے زاویے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ سماج، معاش، سیاسیات، نفسیات، اخلاقیات، تاریخ، تصوف، روحانیت اور سائنسی موضوعات کو ایک حسنِ ترتیب و توازن کے ساتھ برتا ہے۔

رشید امجد بدلتے نظام کی ٹوٹ پھوٹ کے درمیان ناآسودہ لمحوں کے لکھاری ہیں۔ یہ انتشار ایک کرب اور کبھی کبھار اذیت ناک کیفیت میں ان کہانیوں کا موضوع بنتا ہے۔ پورا سماج اس آفت زدہ انتشار کی لپیٹ میں ہے۔ چاروں اطراف بے حسی، مردہ دلی اور ایک تکلیف دہ بے نیازی کی صورت حال ہے۔

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

> "رشید امجد کی زندگی اور ادب میں جو مطابقت ہے۔ وہ اس دور ناہنجار میں ایک کرامت ہے۔ خدا کرے وہ باکرامت زندہ رہیں، لکھتے رہیں۔ اور ان لوگوں میں شامل ہو جائیں۔ جو اپنی نسل کی طرف سے تاریخ کو جواب دیتے ہیں"۔ (۱)

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، الخیر یونیورسٹی، بھمبر۔

کہانی "حسرت چشیدہ" میں کچھ ایسا ہی موضوع ہے۔ جہاں بیوی مکالمہ کرتی ہے :

"تم اکیلے تو اس سارے نظام کو ٹھیک نہیں کر سکتے۔ بیوی بولی۔ ایک بہت بڑی مشین جس طرح چل رہی ہوتی ہے۔ ایک آدھ پُرزا اس کی چال سیدھی نہیں کر سکتا۔ کرلے گا تو ٹوٹ پھوٹ جائے گا"۔(۲)

اور یہ امر انتہائی نا قابل بیان بھی ہے کہ مشین کا ایک پرزہ درست چلے بھی تو دوسرے پرزوں کی خرابی کا مداوا نہیں کر سکتا۔ یہ ایک زوال پذیر، خستہ حال معاشرے کی حالتِ زار ہے۔ ایسے معاشرے میں درد مند اور حساس انسان تماش بین بن کر نہیں رہ سکتا اور خود کو منظر سے غائب کر لیتا ہے۔

"اندر ایک باہر۔ ایک کو تو قبر میں گرنا تھا۔۔۔ جب عمل کا وقت آیا، تو جانے کیا ہوا۔ اُس نے اپنے آپ کو قبر میں دھکیل دیا۔ اور اندر والے کو شہر کی طرف کر دیا۔ گرتے گرتے اُس نے سوچا۔ تماش بینوں کے اس مردہ شہر میں کوئی تو زندہ ہو"۔(۳)

کرم زدہ اخلاقیات اور اہل شہر کی مردہ دلی ناسور بن کر اجتماعی زندگی کے رگ وپے میں سرائیت کر گئی ہے۔ تمام فضا بیمار زدہ ہو کر نہ تو کسی کا محاسبہ کر سکتی ہے اور نہ کسی کو دوش دے سکتی ہے۔ ہر فرد دوسرے کے لیے مشکوک ہے۔ ظاہری بدن پر اندر کی بیماریوں کے اثرات مرقسم ہوتے نظر آتے ہیں۔ ہر ایک تمام صورتِحال جانتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے سے اپنا آپ چھپاتا پھرتا ہے۔

"اُس نے سوچا۔ سارہ شہر ہی نشان زدہ ہے۔ پھر کون کس سے پوچھے۔ اور کیا پوچھے؟۔۔۔ ہم ہی قاتل ہم ہی مقتول، سو حساب برابر ہوا۔۔۔ اب اس نے سوچنا بند کر دیا ہے۔ سو نہ اپنے ہاتھوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ نہ دوسرے کے۔ لیکن کبھی کبھی خیال آتا ہے۔ کہ۔۔۔ نشان تو ہیں"(۴)

تمام صورتِحال کو سمجھنے کی یہ وہ صلاحیت اور کیفیت ہے۔ جو بظاہر نظر نہیں آتی۔ لیکن مصنف کے اندر نامعلوم سے معلوم کے علم کی کئی جہتوں سے پردے اُٹھاتی چلی جاتی ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر حسرت (کاسگنجوی) لکھتے ہیں:

"رشید امجد نے علم حاصل ہی نہیں کیا۔ علم کو برتا بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے۔ تو غلط نہ ہو گا۔ کہ علم حاصل کرنے کی لگن نے ہی رشید کو اخلاقیات اور انسانیت کے قریب کر دیا"۔(۵)

لیکن پھر بھی یقین اور ایک بے یقینی کی کیفیت ہے۔ موجود سے ناموجود کا تسلسل، ہونے سے نہ ہونے کی گواہی، لیکن حقیقت تو بہر حال حقیقت ہے۔ نظروں کا مستقل دھوکہ ناممکن ہے۔ اور کبھی کبھی یہ کیفیت انسان کی دنیاوی اور روحانی تاریخ کے مختلف واقعات میں بے چینی سے دل و دماغ کا سکون تلاش کرتی ہے اور کبھی اپنے مسائل و معاملات کے لیے متجسس نظر آتی ہے۔ کہانی "شہر گریہ" کچھ ایسی ہی صورت حال کی عکاس ہے۔

یہ کہانی مصنف کے فن کی ارتقائی صورت حال کا ایک تسلسل ہے۔ مذہب، تاریخ، تفکر کے عناصر، عروج و زوال کی کہانی، شہروں کا گم ہو جانا، سوچوں کا مفلوج ہونا، ایک داخلی اضطراب اور بے چینی کی فضا۔

بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیّر:

"رشید امجد کا افسانہ جدید اردو افسانے کا محض نمائندہ نہیں۔ اسکا تاریخی بیانیہ بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں جدید اُردو افسانہ ایک نئی جہت میں اپنی تاریخ اور روایت کی تشکیل کرتا ہے۔ "(۶)

در حقیقت مصنف اپنے نظام کی شکست و ریخت اور اپنے شہروں کی اپنے ہی ہاتھوں تباہی پر فریادی ہے۔ نظام کی مکمل تباہی کا نقشہ۔ ایک تماشا گاہ اور سب محض تماشائی۔

"سو وہ روتا تھا۔ جس طرح بنی اسرائیل روتے تھے۔ جب بخت نصر نے انہیں بابل و نینوا میں قید کر رکھا تھا۔ وہ روتے تھے اُن خطاؤں کو یاد کر کے، جہاں وہ سر اُٹھا کر چلتے تھے۔ زیتون کی سر سبز شاخوں کو یاد کر کے۔ روتے روتے ہی لمحہ بھر کیلئے خیال آیا۔ کہ بنی اسرائیل کی مصیبتیں تو ایک دن ختم ہو گئیں۔۔۔ اس شہر کو جو اب ملبہ بنایا جارہا ہے۔ دوبارہ کون آباد کریگا۔؟ آنسو اور تیزی سے اُمڈ آئے۔ اُمڈتے ہی چلے گئے"۔(۷)

رشید امجد کی کہانیوں کا بہاؤ ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں کا موڑ مڑتا ہے۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"رشید امجد نے حال کے نقطے پر کھڑے ہو کر ماضی اور مستقبل دونوں سے رابطہ قائم کیا"۔(۸)

کبھی حال، کبھی ماضی، کبھی مستقبل، کبھی ظاہری دنیا، کبھی باطنی احوال اور کبھی مرشد سے ہمکلامی۔ جو مصنف کے اندر کا ایک کردار، اُن کے ضمیر کی آواز، ایک باطنی و روحانی کشف و کرامات کی ریاضت کی کیفیت۔ اور اس کردار کے ساتھ اکثر اُن کا فلسفہ زمان و مکاں بھی بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ زماں کی الہامی و روحانی وارداتیں اور مکان کے بعض ناقابل یقین نشیب و فراز۔ ان سے متعلق تمام کا تمام علم مرشد اور مصنف کا ایک مکالمہ بن جاتا ہے۔ مصنف کی اکثر کہانیاں ایسے ہی مکالموں کی بُنت پر تشکیل پاتی ہیں۔ کہانی "جادۂ موجِ سراب" میں مرشد کی ہدایت آتی ہے:

"مرشد کہتا ہے یہ اپنی دنیا ہے۔ اپنے وقت کے دائرے سے نکل کر یہاں آگیا ہے۔۔۔ ہر مکان کا اپنا زماں ہے۔ اور ہر زمان کا اپنا مکاں"(۹)

فلسفۂ زندگی کے بارے میں تفکر اور موت کیلئے تجسس مصنف کے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک ہے۔ اختیار اور بے اختیاری کے درمیان سانس لیتا ہوا انسان اور اُس کی حقیقت کیا ہے۔ بہت کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں۔ نہ حاصل، نہ وصول۔ تہی دست اور تہی داماں۔ اُن کی اکثر کہانیوں کا موضوع اس کے قریب قریب رہتا ہے۔

کہانی "صحرا کہیں جسے" "تمنا بے تاب" اور دیگر کئی کہانیوں میں فلسفۂ زمان و مکاں کو منفرد انداز میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ کہانی "رائیگاں کی دھول" میں فلسفہ زمان و مکاں جدت کے پیرائے میں علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے فلسفہ حیات و ممات سے وابستہ نظر آتا ہے۔ جس کا کردار "ایک مچھلی" ہے۔ جس کے بارے میں سوچنے والا کردار خود مصنف ہے۔

> "دُوسری مچھلی مری تو اُسے خیال آیا۔ کہ ان کی موت اور زندگی پر میرا کوئی اختیار نہیں۔۔۔یہی سارا کھیل ہے۔ اُس نے سوچا۔ زندگی کا تسلسل بھی شاید یہی ہے۔ لیکن ہماری مرضی کا اس میں کوئی دخل نہیں"(۱۰)

اور بعض اوقات ایسے ہی موضوع کے لیے مصنف بہت سے عوامل اور تشکیلی عناصر کو باہم یکجا کر کے کہانی کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ لیکن کہانی جہاں سے چلتی ہے۔ دائرے کا چکر مکمل کر کے واپس پلٹ آتی ہے۔ یہ سفر حیات یا حالت قید۔ علم کی منتہا پر پہنچا ہوا انسان بھی لاعلم ہے۔ بے بس اور بے اختیار۔ مصنف کی کہانیوں کے تمام عوامل اسی جانب متحرک ہیں۔

مرشد، مجذوبیت، راز، بھید، خسارے کی زندگی، داخل اور خارج کی جنگ، تاریخ، ماضی، حال اور مستقبل کی جانب رینگتی ہوئی گزرگاہ، سب کچھ حالت سفر میں ہے۔ فکر بھی اور ذکر بھی۔ کہانی "فرصت شوق" کا مخصوص رنگ یہی دکھائی دیتا ہے۔

> "تو ساری کہانی ایک دائرے میں ہے۔ وقت اور مقام کے دائرے میں قید۔۔۔ بھید، بھید، جسے کوئی نہیں جانتا، سوائے اُس کے، باقی سب بے بس اور خسارے میں ہیں "(۱۱)

ہر طرف بھید ہی بھید ہے۔ راز در راز۔ اسی لیے ظاہری نگاہ باطنی اسرار اور روح کے داخلی حصار میں پلٹتی ہے۔ اور رشید امجد کی کہانیوں میں ہمیں موت اور اس کے متعلقات جو ابتداء میں بھی کہانی کا جزو خاص تھے۔ اُن کے رنگ اب کی کہانیوں میں بہت پختہ اور گہرے نظر آتے ہیں۔ حجرے، مزار، عقیدے، عقیدت اور ان سے متعلقہ موضوعات اب بھی کہانی کا مخصوص مزاج ہیں۔ کہانی ناتسکین اضطراب میں مزار، صاحب مزار انہی داخلی وارداتوں کے امین اور انسان کی آنکھوں سے اوجھل صاحب کائنات کے اِسرار ہیں۔

> "یہ مزار اپنی جگہ کیوں بدلتا ہے۔۔۔ ابو صفہانی الرحیمی مسکرائے، مزار جگہ نہیں بدلتا۔ تمہاری نظر کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔۔۔ہاں میں صاحب مزار ہوں۔ میں ہی مزار ہوں اور میں ہی فاتحہ خوانی اور میں ہی منتیں مانگنے والا"(۱۲)

جب انسان خود ہی عجب ٹھہرا تو اس کی زندگی اُس سے بھی عجیب و غریب ہوئی۔ پوری زندگی ایک سفر، اور اختتام سفر بھی آغاز سفر بن گیا۔ انتہائے سفر پھر ایک دائرہ۔ جہاں سے چلے تھے۔ بات پھر وہیں آن کھڑی ہے۔ دائرہ در دائرہ پھر تجسس کی اَن گنت راہیں، اَن گنت گرہیں۔ ہر قدم پر نئی دُنیائیں، جو پرانی ہو کر پھر انسان کو قدم بہ قدم آگے دھکیل رہی ہیں۔ سب کچھ ایک جیسا پھر بھی ایک دوسرے سے مختلف۔ یہ سفر کا ایک تسلسل ہے۔ جسکا کوئی خاتمہ نہیں۔ کہیں سے بھی انسان کے نکلنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ حیرت کدہ ہے۔

"اِس دائرے میں زمان و مکاں نہیں، یہ گلیاں ان گنت دُنیائیں ہیں۔ جو یہیں سے شروع ہوتی ہیں اور یہیں ختم"(۱۳)

رشید امجد کے ایسے موضوعات میں دریافت نہیں بلکہ فلسفہ کی دنیا کے اَن گنت نشیب و فراز ہیں۔ جو باہم الجھتے چلے جارہے ہیں۔ سلجھی ہوئی ڈور ہاتھ نہیں آتی۔ شاید زندگی کا یہی مزاج ہے۔ اور یہی اس کی اصل حقیقت۔ کہانی افسوس لا حاصل کا، انسان کی ہتھیلی پر کھوٹے سکّے کھنکتے ہیں۔ اصل ایک بھی نہیں۔ مرشد پھر ہدایت کا پیامبر بنکر اُبھرتا ہے۔

"کہیں دُور سے مرشد کی آواز آئی۔ "پروں میں سکت نہ ہو اور اُونچی اُڑان کا خواب دیکھو۔ تو یہی ہوتا ہے۔"(۱۴)

لیکن درحقیت یہ اُونچی اُڑان کے خواب نہیں۔ یہ تو فلسفیانہ مباحث ہیں۔ جنکا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ مشاہدہ در مشاہدہ۔ دیدوادید۔ لیکن حقیقت حال "کچھ اور" "اور کہیں اور" ہے۔ جو نگاہوں سے پوشیدہ، لیکن اُس کی بجلیاں مسلسل ظاہری وجود پر گر رہی ہیں۔ اندر کی فکر آمیز فضا دھماکوں کی زد میں ہے۔ لیکن مادی وجود بظاہر ثابت و سلامت۔ آواز اور عکس کے درمیان متحرّک۔

"اصل میں یہ سارا کھیل بیٹری ختم ہوجانے کا ہے۔

"تو اصل تو بیٹری ہوئی" اس نے مرشد سے پوچھا مرشد ہنسا، خوب ہنسا پھر بولا۔ کس کی بیٹری کتنی دیر چلتی ہے۔ یہ تو وہی جانتا ہے۔ جو وجود میں اِسے فٹ کرتا ہے"۔

"بیٹری ختم ہوجاتی ہے۔ تو وقت رک جاتا ہے"۔

"وقت تو نہیں رُکتا" مرشد نے کہا" وجود اس کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔"

"کسی اور مکاں میں چلا جاتا ہے؟" اُس نے پوچھا۔ "جہاں وقت کا ایک اور دائرہ ہوتا ہے"۔(۱۵)

رشید امجد کے اِسطرح کے موضوعات اور مباحث درحقیقت اُن کے تصور موت سے بندھے ہوئے ہیں۔ وہ موت کے موضوع کو ہر زاویے سے دیکھتے، پرکھتے اور تجزیہ کرتے ہیں۔ کہیں موت کے بارے میں سوچنا، کہیں موت کو فلسفیانہ نقطہ نظر سے دیکھنا، کہیں حیرت کدہ کے لیے متجسس ہونا اور کہیں مشاہدہ سے بات بڑھتے بڑھتے تجرباتی سطح سے ہمکنار ہوتی نظر آتی ہے۔ اس موضوع کے بارے میں اُن کی فکر کا بھی ایک تسلسل ہے۔ حقیقت حال کے ساتھ دھندلکوں میں تیرے ہوئے مناظر درپیش ہیں:

"اب اسے اپنے آس پاس دھندلکے سے نظر آتے تھے۔ سرمئی دھند میں سے گزرنا اچھا لگتا تھا۔ آگے۔ آگے کیا تھا۔ کون جانے۔ کچھ ہے بھی یا نہیں۔ اور مڑ کر دیکھنے کی ہمت۔ رات کو سب اکٹھا کھانا کھاتے تھے۔ بیٹے، بہویں، قہقہے لگاتیں۔ بیوی بھی ان میں شامل ہوجاتی۔ لیکن وہ کچھ اداس بھی ہوجاتا۔ یہ محفل اور کتنے دن؟ سڑک کا اختتام ہونے والا ہے۔ آگے کھائی ہے یا پل، کون جانے، کیسے جانے۔ سارے اعتقادات ڈگمگا رہے تھے۔"(۱۶)

موت کے موضوع سے متعلق یہ پہلو کبھی خوف، کبھی خواہش، کبھی حسرت اور کبھی انتظار بن جاتا ہے۔ اس صورت حال کی بھی کئی کیفیات ہیں۔ کبھی شعور، کبھی لاشعور اور کبھی تحت الشعور کی دنیاؤں میں یہ موضوع خواب آلود کیفیت میں کہانی کی زیریں سطح پر موجود رہتا ہے۔ کہانی ''سبزہ زہر آب'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''یہ احساس کیسے ہوا۔ کہ وہ زندہ نہیں۔ اس وجہ سے نہیں، کہ معمول خود ایک موت ہے۔ اور وہ پچھلے کئی برسوں سے معمول کی اس موت کا شکار ہو کر ایک حوالے سے مر چکا تھا۔ لیکن اس بار احساس مختلف تھا۔ اسے لگ رہا تھا۔ وہ طبعی موت مر چکا ہے۔ اسکا مادی وجود باقی نہیں''(۱۷)

رشید امجد کا تصورِ موت اس لحاظ سے بھی ایک ارتقائی صورت حال کا حامل ہے۔ کہ وقت کی ہر لمحہ ترقی پذیر سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کے دور کے باعث انسانی فکر میں جو ردوبدل اور سوچ کے نئے نئے آفاق اُبھر رہے ہیں۔ نت نئے تجربات اور انسان کے مادی وجود کا بصورت موت خاتمہ اور اس کے آگے کے مزید مراحل۔ یہ تمام کے تمام ایک فکر آمیز سوچ سے منسلک ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال کا بظاہر ہر مذہب اور عقیدے سے کوئی واضح رابطہ نظر نہیں آتا۔ لیکن کئی حوالوں اور واسطوں سے حیات بعد موت میں پوشیدہ تجسس انسانی فکر کو سوچ کی کئی نئی دنیائیں عطا کرتا ہے۔ اور وہ حقائق اور معلومات جو ان کے شعور سے وابستہ ہیں۔ اُن کا جواز تلاش کرتا ہے۔ اسطرح کے موضوعات کو سائنسی موضوعات کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور سائنس کا مزاج اپنی تحقیق کے حوالے سے مذہب کے قریب تر بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے موضوعات رشید امجد کی ابتدائی کہانیوں میں بھی موجود ہیں۔ لیکن اُن کی دورِ حاظر کی کہانیوں میں اس موضوع کی کئی پرتیں نظر آتی ہیں۔ گویا موضوع کی یک رنگی میں بھی ایک ہمہ رنگی پائی جاتی ہے۔

> ''ہر شخص اپنے ڈی این اے کا تصویری وجود ہے۔ جب یہ تصویر دھندلی ہوتی ہوئی مٹ جاتی ہے۔ تو ڈی این اے پھر بھی موجود رہتا ہے۔۔۔ کیا بات صرف اتنی سی ہے۔ یا پھر واقعی اپنی تصویری حیثیت ختم کر چکا ہے۔ اور اب صرف ڈی این اے ہے۔ جو اپنا وجود تو محسوس کر سکتا ہے۔ دوسروں کو اپنے ہونے کا احساس نہیں دلا سکتا۔''(۱۸)

اسطرح کے موضوعات اور اُن کی توجیہات فلسفہ حیات و مما ت سے متعلق مصنف کی فکر کی شدید نوعیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ غور و فکر کا تسلسل، سوالات و جوابات کا اندر ہی اندر بننا، ٹوٹنا کسی نقطہ انتہا تک بھی نہیں پہنچ پاتا، کیونکہ تفکر کی فضا پھر سے متحرک ہو جاتی ہے۔ اور جب کہیں سے کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔ تو یقین و بے یقینی کے درمیان ذہن پھر سے الجھنے لگتا ہے۔

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> ''رشید امجد کا فن احساس کی ان سطحوں کو چھونے کی جانب سرگرم سفر ہے۔ جو آسانی سے دسترس میں نہیں آتیں۔ وہ ان مسئلوں اور الجھنوں کے بارے میں سوال اُٹھاتے ہیں۔ جنہیں آج کے انسان نے نئے عہد کا موڑ مڑتے ہی اچانک سامنے پایا ہے۔''(۱۹)

ایک ذہن، ایک وجود اور اَن گنت سوچوں کے جہاں۔ بظاہر پر سکون لیکن بباطن انت کا شور۔ بے چینی، اضطراب۔ وہ اور اُس کی ذات موجود سے ناموجود کے درمیان کہاں پر ہے۔ ہے بھی یا نہیں؟۔ ایسی صورت حال میں ٹھوس مادی وجود شاید دکھائی نہیں دیتا۔ اور صرف تفکر کی فضا میں تحلیل ہونے لگتا ہے۔

"لیکن اُس کے ہونے کا احساس بس اُسے خود ہی تھا۔ سوچتا، یہ مجھے کیوں نظر انداز کر رہے ہیں۔ کیوں؟۔ بس اس کیوں کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ لیکن ایسا تو نہیں کہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ میں ان میں موجود نہیں۔ پھر کیوں، کیوں موجود نہیں۔۔۔ میں تو پورے حواس کے ساتھ ان میں موجود ہوں ۔ کھا پی رہا ہوں۔ باتیں کر رہا ہوں۔۔۔ اگر میں سچ مچ موجود نہیں تو یہ دھندلاہٹ کیا ہے؟۔۔۔ اگر یہ وہ نہیں تو پھر یہ کون ہے۔ اور وہ کہاں ہے"(۲۰)

انسانی وجود اور اس سے متعلقہ موضوعات، داخلی و خارجی کائنات، مشاہدہ، شاہد، مشہود اور ایسے دیگر تمام فکری عوامل رشید امجد کے افسانے کی بنت کو ایک خاص قسم کے انٹی ایکٹ سے ہمکنار کرتے ہیں۔ جہاں کہانی بھی موجود ہے۔ اور اس میں حقیقت نگاری، انسانی رشتے اور جذباتی عوامل کے ساتھ ساتھ اس کی داخلی فضابندی میں بھی ایسے فکری عناصر اُسے انتہا درجے کی فکری پختگی عطا کرتے ہیں۔ ایسی فکری پختگی، جو کسی طور پر بھی خشک مزاج نہیں لگتی۔ بلکہ ہلکا پھلکا انداز۔ جیسے کوئی فرد اپنے ٹی وی لاؤنج میں اپنوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ کبھی شعور، کبھی لاشعور اور اسی طرح حقیقت، خواب، دیکھی، ان دیکھی کئی دنیاؤں کی جانب وقت، حالات اور معمولاتِ زندگی کے قدم سرکنے لگتے ہیں۔ مکالمہ کبھی اپنے آپ سے، کبھی اہل خانہ سے اور کبھی فلسفہ حیات کی اُلجھتی ہوئی گتھیوں سے۔ اور قاری کے مطالعہ کے بھی ایک ساتھ کئی پرت کھلنے لگتے ہیں۔ لیکن ایک داخلی بے چینی، اضطرابی کیفیت اور مسلسل اُداسی بھری تنہائی کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ کہیں یہ سلسلہ ذات کے گرد ہالہ بناتا ہے۔ اور کبھی ہمہ گیر اجتماعی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ کہانی اضطراب شام تنہائی، تمنا بے تاب، دشتِ خواب، ہنوز خواب میں اور لمحہ ناموجود میں موجود، کے علاوہ دیگر کئی کہانیوں کا مخصوص مزاج اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ اس اضطراب اور بے چینی کا ایک پہلو فکری کہا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا پہلو بگاڑ شدہ معاشرے سے منسلک ہے۔ جہاں کوئی نہ تو درست حالت میں ہے اور نہ اپنی درست جگہ پر موجود ہے۔ پورا نظام اتھل پتھل ہو رہا ہے۔

"پورے نظام میں اتنی پیوند کاری ہو چکی ہے کہ ان کی اصلیت ہی باقی نہیں رہی۔ ہر شے خود مختار ہو چکی ہے"(۲۱)

پورے اجتماعی ماحول، ردوبدل، ٹوٹ پھوٹ اور اس کے باعث اس نظام کی بگڑتی شکل اب جیسے ناقابل شناخت ہو چکی ہے۔ یہ نظام اب کسی اکائی سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ رشید امجد کی کہانیوں میں ایسے اجتماعی ماحول کے کئی زاویے بے نقاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی حوالے سے مہدی جعفر نے رشید امجد کے نام اپنے خط میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

"آپ کی انفرادیت مانتا ہوں۔ آپ کے یہاں آدمی سے زیادہ ماحول بات کرتا ہے، بات کہتا ہے، بات پیدا کرتا ہے۔ آدمی چپ ہے یا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ یا بے زار اور بے نور ہے۔ یا بے حس ہے۔ ارد گرد کا ماحول یا سچویشن حس اور روح کی نمائندہ ہے"(۲۲)

اسی ٹوٹتے ہوئے نظام کا ہی شاخسانہ ہے کہ گھر کی چار دیواری میں محبتوں اور جذبوں میں بندھے ہوئے رشتے بھی ٹوٹ رہے ہیں۔ کہیں وقت کی مجبوری حالات کی معذوری۔ گھر کی دہلیز سنسان ہو رہی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام تلاش روزگار کی بہانہ جوئی میں گھر کی چوکھٹ بانٹ رہا ہے۔ یہ رشید امجد کی کہانی کا وہ سچ ہے۔ جو ہر گھر کی کہانی اور اُسکے در و دیوار کی سنسانی کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ تنہائیوں کی موت مرتا ہوا بڑھاپا صرف محسوس کر سکتا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شاید لفظوں کی تلاش میں ہے۔ دیارغیر کی کشش میں سرکتی ہوئی اولادوں کا دُکھ اب نیٹ کا سہارا رہا ہے۔ رشید امجد کی تقریباً ہر کہانی کا موضوع کہیں کُلی اور کہیں جزوی طور پر اس موضوع سے بندھا ہوا، جگ بیتی ہی نہیں، آپ بیتی بنتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسی کہانیاں حقیقت سے جڑی ہوئی ہیں۔

"اُس نے دیوار پر لگی بیٹوں اور ان کے بچوں کی تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس یہ تصویریں ہیں اور سوچا شاید یہی میرا مقدر ہے۔ کہ تصویروں کے ساتھ رہوں اور دیواروں سے باتیں کروں"(۲۳)

یہاں بکھرتے ہوئے خاندانی نظام پر شدید چوٹ اور طنز کی صورت حال ہے۔ جسے افسانہ نگار نے کمال ہنر سے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کا حامل بنا کر فلسفہ حیات کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ کچھ اسطرح سے کہ کہانی برقرار بھی رہتی ہے۔ اور تفکر کا موڑ بھی مڑ جاتی ہے۔ کہانی کے اسی پہلو سے تنہائی کا کرب جنم لیتا ہے۔ جو غیر محسوساتی اور کہیں شدید محسوساتی سطح پر کہانیوں پر چھایا ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

"انہوں نے اُن بوڑھے والدین کے کرب کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ۔ جن کے بچے اپنا مستقبل بنانے کے لیے ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اور بوڑھے والدین کو تنہا چھوڑ جاتے ہیں"(۲۴)

اور دیارغیر کی کشش میں اپنی مٹی سے جدا ہونے والوں کے کیا کیا مسائل، پیچیدگیاں، دُکھ، کرب اور اذیت پر مبنی کہانیاں ہیں۔ رشید امجد نے اُن کا بھی بخوبی احاطہ کیا ہے۔ غیر قانونی طور پر پردیس میں رہنے والے اپنے سائے کی لرزش سے بھی ڈرتے ہیں۔ وہ کون ہیں کہاں ہیں؟ گویا اپنے آپ سے بھی چھپتے پھرتے ہیں۔ اپنی شناخت کو بے نشان کرتے ہوئے وہ اپنی ذات کے لیے سوالیہ نشان ہیں۔ کہ کہیں قانون کی زد میں نہ آجائیں۔ اپنی اولاد کے لیے دھکے کھانے والے بھی اپنی اولاد کو دوسروں کے سامنے اپنا نہیں کہہ سکتے۔

"بچی بیمار ہو جائے، تو ہسپتال نہیں جاسکتی۔ سکول بھی نہیں جاسکتی۔ کیونکہ یہ غیر قانونی ہے۔ پیدائشی غیر قانونی۔ ذرا چپ رہنے کے بعد بولا۔ یہ پکڑی گئی تو ہم دونوں۔۔۔"(۲۵)

رشید امجد کی کہانیوں میں داستان گو ایک کردار ہے۔ اور ایک تجربے، مشاہدے اور مطالعہ کا نام بھی ہے۔ یہ ایک آفاقی مطالعاتی نگاہ کا حامل ہے۔ جس کی بند مٹھی ماضی کے تجربوں سے بھری پڑی ہے۔ جس کے جھریوں بھرے چہرے پر زمانے رینگ رہے ہیں۔ تاریخ، سماج، اور آفاق کے تمام نشیب و فراز اور عروج و زوال کا قصہ اُس کے سامنے تماشائشب و روز والی بات ہے۔ وہ شوق آوارگی میں قریہ قریہ گھومتا ہے۔ کسی کو کچھ کہے، کسی کی کچھ سنے، کسی کو کچھ بتائے۔ لیکن سب اپنی تگ و دو میں مست و مشغول۔ کوئی رُکتا نہیں۔ کوئی سنتا نہیں۔ وہ وقت گزر گیا۔ جب قصہ گو نہ صرف ہماری تاریخ بلکہ ہمارے روز مرہ معاملات زندگی میں بھی بُری طرح دخیل تھا۔ اور لوگ اخلاقیات سے لیکر تاریخ اور حقائق سے لیکر مابعد الطبیعیات سے متعلق موضوعات پر اُس کی سیر حاصل گفتگو کے منتظر ہوتے تھے۔ مگر اب داستان گو کسی کی ضرورت نہیں رہا۔ گویا داستان گوئی کے لیے تجسس رکھنے والے اب ناپید ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ایک درد مند موضوع بن کر مصنف کی کہانیوں میں نہ ختم ہونے والا دکھ ہے۔

> ''سفید ریش رعشہ زدہ ہاتھ میں سال خوردہ لاٹھی لیے وقت کے فٹ پاتھ پر کہانی سنانے کا شوق لیے منتظر تھا۔''(۲۶)

لیکن افسوس کہ اب سننے والا کوئی نہیں۔ وہ جو سننے والے تھے۔ وہ ہر بات سے بے نیاز اور بے خبر ہیں۔

> ''وقت کے کوڑے دان میں وہ بھی زمانے کی مسترد کی ہوئی اشیاء کی طرح ایک طرف پڑا تھا۔ داستان گوئی کا شوق بھی اس کے اندر موجود تھا۔ لیکن اب داستان سننے والے کہاں۔''(۲۷)

اب معاشرہ ایک اجتماعی بے حسی کی زد میں ہے۔ اب اگر انہیں جھنجوڑا بھی جائے۔ تو بہتری کی بجائے یہ بے حسی موت کی سی نیند میں بدل جاتی ہے۔

> ''سن تولو بھائی، سن تولو۔ وہ آخری جاتے ہوئے کو مخاطب کرتا۔ لیکن کوئی مڑ کر نہ دیکھتا ''(۲۸)

بقول منشایاد:

> ''ان کے افسانوں میں اپنے عہد کا دل دھڑکتا ہے۔ انہوں نے اپنے عصر کے سیاسی، سماجی اور خارجی معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ انسان کی باطنی دنیا میں ہونے والی توڑ پھوڑ اور آشوب کو بھی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔''(۲۹)

رشید امجد کے موضوع اور اُسلوب بیان کا باہم ایک فطری اور اٹوٹ رشتہ ہے۔ ہر موضوع اپنے لفظوں میں بُنا ہوا۔ اور ہر لفظ اپنے موضوع کا برمحل انتخاب۔ یہ ایک فطری اور پیدائشی فنکار کا ہنر ہے۔ اور موضوع گویا اپنے لفظ کی کلیت میں جنم لیتا ہے۔ تشبیہاتی و استعاراتی سطح از خود موضوع کی بُنت کا حصہ بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے موضوع اور اسلوب بیاں کو ہم ایک لکیر کھینچ کر ایک دوسرے سے فرق نہیں کر سکتے۔ جب موضوع کی بات کرتے ہیں تو لفظ خود وہاں پہلے سے موجود۔ اور جب لفظ پر قلم رُکتا ہے۔ تو موضوع اور اُس کے لب و لہجے اور مزاج میں رچا بسا ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہنا بجا ہو گا۔ کہ ہر سچا جذبہ اور خالص موضوع اپنا اظہاریہ (زبان) ساتھ لیکر آتا ہے۔ یہی خوبی اُن کی کہانی کے موضوع اور اسلوب کو اکائی کی شکل عطا کرتی ہے۔

اس ضمن میں رشید امجد خود لکھتے ہیں:

"میں کہانی جوڑتا نہیں، ٹکڑے اکھٹے نہیں کرتا۔ کہانی ایک خیال کی طرح میرے ذہن میں آتی ہے۔ اور تخلیقی عمل سے گذر کر ایک وحدت کی طرح کاغذ پر بکھر جاتی ہے۔ میں اس کے لیے لفظ تلاش نہیں کرتا۔ خیال اپنے لفظ خود لیکر آتا ہے"(۳۰)

کہانی اکثر مختصر اور بھرپور تاثر کے پس منظر سے جنم لیتی ہے۔ خیال کی کوئی ایک توانا متفکر کیفیت اس کی بنت میں متحرک بنتی ہے۔ رشید امجد کا اسلوب موضوع کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ تشبیہ، استعارہ، علامت سب کا استعمال فطری اور برمحل ہے۔ گویا ایک خواب آلود رومانوی سی فضا جنم لیتی ہے۔

"روشنی کی کرنیں غائب ہوگئی تھیں۔ بارش کی کنیوں نے جھیل کی سطح پر رقص شروع کردیا تھا۔ بارش کب کی تیز ہوگئی تھی۔ اور مسلسل پھوار جھیل کی سطح پر مجذوبوں کی طرح رقص کررہی تھی"(۳۱)

اسلوب کا یہ رنگ بڑا مختلف، منفرد اور مخصوص انداز کا حامل ہے۔ اُن کی کہانیوں کا مطالعہ از خود اپنی شناخت کراتا دکھائی دیتا ہے۔

"اس کے بدن کا پلستر ادھڑنے لگا تھا"(۳۲)

اپنے فن کی اس فطری صلاحیت کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں۔

"میں نے شعری وسائل کو معنوی دبازت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور انہیں تخلیقی سطح پر اپنے اسلوب کا حصہ بنایا ہے"(۳۳)

بعض مقامات پر فلسفیانہ انداز فکر مقامی الفاظ میں ایک عجیب امتزاجی کیفیت رکھتا ہے۔

"ایک گھنی تاریخ خاموشی نے ہمیں اپنی بُکل میں دبالیا۔ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ یہاں تو وقت تھا ہی نہیں۔ یہ زماں ہے نہ مکاں"(۳۴)

اسی طرح مقامی الفاظ کا استعمال کچھ اسطرح سے بھی اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔

"روز دوائیوں کا پھکا مارتا ہوں"(۳۵)

بظاہر لفظ 'گٹر' اور 'شہر' دو مختلف موضوعات جگہیں اور کیفیات ہیں۔ لیکن رشید امجد کے یہاں گذشتہ کہانیوں کی طرح 'گٹر' اور 'شہر' بھی علامتوں کی صورت سامنے آتے ہیں۔ معاشرے کی گھٹن، آلودگی، تاریکی، مردہ دلی کا اظہار اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا ۔ کہانی "افسوس لاحاصل کا" میں لکھتے ہیں۔

"تو کیا ہم سب گٹر میں ہیں؟ اُس نے سوچا۔ اور شہر، شہر کہاں گیا؟

یہ گٹر ہے یا شہر یا گٹر ----کچھ سمجھ نہ آیا"۔(۳۶)

گٹر اور شہر ایک دوسرے کے متبادل -----اِس صورت حال کی اس سے بہتر عکاسی ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کہانیوں میں طوطا، بلی، کچھوا، چڑیا اور دیگر پرندے بھی علامتیں ہیں۔ اور کہیں یہ کردار علامتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ کبھی صیغہ واحد متعکلم خود بھی پرندے کا روپ دھار لیتا ہے۔

"پرندہ پروں سے چونچ نکال کر اُسے دیکھتا ہے اور پھر سر نیہوا ڑ کر کسی اُداس خواب کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔"(۳۷)

اکثر کہانیوں کا آخری پیراگراف ایک مختصر جملے پر ختم ہوتا ہے۔ مثلاً

"گرتے گرتے اُس نے سوچا۔ تماش بینوں کے اس مردہ شہر میں کوئی تو زندہ ہوا "۔

"لیکن داستان سننے کا وقت اور شوق کسے ؟"

"اُس کی ساری خوشی، گہرے دُکھ میں بدل گئی۔ "

"زندہ ہوا تو کیا، نہ ہوا تو کیا"!

"واقعی انسان خسارے میں ہے"

"کوئی نیا طلسم آئے گا تو اُسے بھی اس طلسم کا ایک حصہ ہی سمجھے گا "۔

"سیاح کو خیال آیا۔ خواب ٹوٹنے کا المیہ بھی کتنا بڑا المیہ ہوتا ہے"۔

"شاید اس کا ہونا ہی اُس کی سزا تھی "۔

یہ انداز کہانی کی تکنیک کی وہ تکمیل ہے۔ جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ کہانی کا آخری جملہ نہ صرف کہانی کار کی فکر کو مربوط انداز میں قاری تک منتقل کرتا ہے۔ بلکہ یہاں سے قاری کی فکر از خود بھی متحرک ہو جاتی ہے۔ رشید امجد کے یہاں انتظار بھی ایک موضوع ہے۔ گھر، نوکریاں، ترقیاں، بچے اُن کی کامیابیاں، ہر طرح کی آسودگی-----لیکن انتظار، پھر بھی-----انتظار-----لیکن کس کا؟--- جبکہ کہنے والے کہتے رہے۔

"مطمئن شخص تھا۔ اچھی زندگی گزار گیا"(۳۸)

یہاں انتظار پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔ بظاہر کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی انتظار۔ حتٰی کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ بکھرتا ہوا خاندانی نظام اور سسٹم کی خرابی بے پناہ اُداسیوں کو آنگن میں بھر رہی ہے۔ یہ پوری معاشرتی زندگی اور اخلاقی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ ہے ۔ جو دیمک کی طرح پورے مشرقی نظام کو تہس نہس کر رہی ہے۔

"انہوں نے ایک تعلق رکھا ہوا ہے۔ خون کا ہی سہی، پرندے نے اداس تو ہونا ہی ہے"۔(۳۹)

رشید امجد کی کہانیوں میں خاندانی نظام میں دراڑیں صاف نظر آتی ہیں۔ جو اس کے کھوکھلے پن کی عکاسی ہیں۔ زندگی کی حقیقت کا بیان صرف موضوع تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اسلوب کا جامہ پہن کر اس حقیقت حال کا تاثر اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔

''مسکراتے لمحے سے نکلتی ایک افسردہ کہانی،'' آسمان دیکھنے کی تمنا''، اور اسی طرح دیگر کئی کہانیوں میں اسلوب کا یہ رنگ اپنا گہرا نقش جماتا ہے۔ مثلاً

''خلا کے اندر چادر اور چار دیواری کے اندر بے انت خلا''(۴۰)

''مٹی تو میں ہوں، مٹی سے بنا اور مٹی میں مٹی ہو جاؤں گا''(۴۱)

''بس ایک وقت ہے جس کا کوئی دروازہ نہیں۔ ایک طرف سے داخل ہو اور دوسری طرف سے نکل جاؤ''(۴۲)

اور کہیں سائنس اور تصوف کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے دیگر کئی کہانیوں کے علاوہ کہانی ''غالب خستہ کے بغیر'' بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

رشید امجد کی کہانیوں کے اکثر جملے از خود متفکر فضا میں اپنا آغاز اور انجام بھی خود ہوتے ہیں۔ جس کی تفہیم کے لیے کسی دلیل اور پس منظر کی ضرورت درکار نہیں ہوتی۔ کیونکہ مصنف اور قاری کا مطالعہ ایک اشتراکی نوعیت کا بن جاتا ہے۔

''یہ سب کچھ تو اس تماشا دیکھنے والے پر منحصر ہے۔ کہ کب وہ اُکتاتا ہے اور اکیوریم کی مچھلیاں بدلنے کا ارادہ کرلیتا ہے''(۴۳)

یہ تو مصنف کا حسن انتخاب ہے کہ اکیوریم میں تیرتی رنگ برنگ مچھلیوں میں بھی وہ فلسفہ حیات تلاش کرلیتا ہے۔ اور طوطے کی موت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ایک طرف فلسفہ زمان و مکاں اور دوسری طرف زندگی کی حقیقت ایک فلسفیانہ پیرائے میں ان کہانیوں کو بنت عطا کرتی ہے۔ اور کہیں پر یہ فلسفیانہ رنگ بڑا گہرا اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے مثلاً

''کرّہ کے کسی بھی حصے سے دیکھیں، آسمان ایک سا نظر آتا ہے۔ لیکن وقت کے دائرے الگ الگ ہیں۔ وہ جس جگہ موجود ہے۔ وہاں اس کی محبتوں کا ایک سلسلہ -----لیکن وہ تو کہیں بھی موجود نہیں''(۴۴)

مرشد اور بیوی کا کردار رشید امجد کی کہانیوں میں آغاز تاحال موجود ہے۔ یہاں بیوی کے کردار کے بارے میں ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی نے بہت پر مغز اور دلچسپ بات کہی لکھتے ہیں:

''رشید امجد کی بیوی بھی ہماری داد کی مستحق ہے۔ یہ وہ ساحل ہے۔ جس نے اس سمندر کو سمیٹ رکھا ہے۔ جسے رشید امجد کہتے ہیں''(۴۵)

یہ کردار کہانی کے موضوع اور اسلوب دونوں کو فطری طور پر آگے بڑھانے میں معاون ہیں۔ کہانی حسرت چشیدہ، دست گزیدہ، فرصتِ شوق کہاں، جادۂ موج سراب، سبزہ زہر آب، اضطرابِ شام تنہائی، مسکراتے لمحے سے نکلتی ایک افسردہ کہانی ''وغیرہ اس کے اہم

حوالے ہیں۔ صیغہ واحد متکلم اب بھی کہانی کا روح رواں ہے۔ کہیں خود کو تلاش کرنا کہیں اپنے ہی اندر تنہایوں کی مار کھانا، کہیں اپنے ہونے یا نہ ہونے کا جواز تلاش کرنا، کہیں اپنا تجزیہ اور کہیں اپنی ذات سے مکالمہ کرنا ہے۔ ---یہی صیغہ واحد متکلم ہے۔ جس کی موجودگی، شدت جذبات اور اس کردار کی دیگر صفات و خصائص ملکر خود رشید امجد کے حوالے سے سوانحی رنگ کو ایک مخصوص پہچان عطا کرتے ہیں۔ قاری کیلئے یہ کہانیاں اس حوالے سے معلومات کا ذخیرہ بے بہاہیں۔ اس رنگ میں کہانی کار کا ماضی، حال، مزاج کے موسم، حالات و واقعات کے بدلتے تیور، سب جابہ جا بکھرے پڑے ہیں۔

"ویسے وہ خود بھی ایک کہانی تھا۔ جسے کب کا لکھا جاچکا تھا۔ لیکن اختتام ابھی باقی تھا۔--- اس کتاب میں
جانے کتنی کہانیاں ہیں ان گنت-----کچھ انجام کو پہنچ گئیں، کچھ پہنچنے والی ہیں"(۴۶)

مجموعی طور پر رشید امجد کی کہانی زمانی اعتبار سے اپنے اور افسانہ نگار کے درمیان فاصلے کم کر رہی ہے۔ کہانی کہنے کا سلیقہ اپنی جگہ موجود، لیکن افسانہ نگار کے شب و روز کا ایک ایک لمحہ اور اُن کے تاثرات کا ایک ایک پہلو کہانی صدقِ دل سے سمیٹ رہی ہے۔ اور وہ اپنے خالق کو بھی محسوس نہیں ہونے دیتی۔ کہ وہ کیسے اور کہاں کہاں اُن کے داخلی کرب اور تنہایوں میں چپکے چپکے بھرپور شرکت کر رہی ہے۔ جس میں رتجگوں کی دھیمی دھیمی آنچ اور دکھائی نہ دینے والا لاحاصلی کا دُکھ بھی سرائیت کرتا جاتا ہے۔

رشید امجد کہانی کو زندگی کی ظاہری سطح کی بجائے اُسے داخلی معنویت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ یہ معنویت نہ صرف موضوع بلکہ کہانی کے تمام کرداروں کو بھی ایک مخصوص علامتی تناظر عطا کرتی ہے۔ مرشد انسان کے اندر کا انٹیلیکٹ ہے۔ جو اپنے ظاہری روپ سے زیادہ اپنے داخلی وجود کی نگہداشت کرتا ہے۔ اور پھر اپنے ہی وجود کی رُوئی بن کر اُسکا محاسبہ کرتا ہے۔ بیوی بچوں کے کردار اگرچہ بظاہر کہانی کے معاون اور مددگار ہیں۔ لیکن انہی کی بدولت درحقیقت افسانہ نگار کو موجود سے ناموجود اور خیال سے حقیقت کے نئے سفر اور زندگی کے خاص مفاہم کو سمجھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔

رشید امجد کی موجودہ کہانیاں، علامتوں کے حوالے سے اپنے خارجی اور عمومی مفاہیم کی ابدی اور سرمدی فضابندی کے لیے رختِ سفر باندھ رہی ہیں۔ اب قاری کی نگاہ کہانی کو بہت جلد سفر حیات کے تناظر میں محسوس کرتی ہے۔ پرانے خوابوں، گزرے حالات، ناآسودگی سے آسودگی تک کا سفر اُن کی اکثر کہانیوں میں بار بار دہرایا جانے والا موضوع ہے۔ لیکن ایسا موضوع جو ہر بار زندگی کی نئی فلاسفی کو سامنے لاتا ہے۔ یہ اُن کی زندگی کی ان تھک محنت، نہ ختم ہونے والی جدوجہد اور سب کچھ پاکر شاید لاحاصل کا شدید احساس ہے۔ آگے کیا ہوگا-----اور------کیا ہونے والا ہے' انسانی زندگی کی تمام تر پونجی اور جدوجہد کا انجام_____؟_____اب رشتوں کی باہمی محبتوں کا پھیکا پن، ظاہر داری، ان کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے خود غرضی اور نفسانفسی کی بھینٹ چڑھ کر چوراہے پر دھرے رکھے ہے۔ کہنے کو بہت کچھ---لیکن لب خاموش-----کہانی کا وہ سفر جو ذات سے کائنات کی طرف گامزن تھا۔ اب کہانی تمام تجربے سمیٹ کر دوبارہ ذات کے دائرے میں ضم ہو رہی ہے۔

رشید امجد کی اس عہد میں لکھی جانے والی کہانیوں کی ایک خاص بات اور ایک اہم پہلو، جو آج کے قاری اور مصنف کی فوری توجہ کا حامل ہے۔ وہ یہ کہ ان کہانیوں میں حیات و ممات کا جو موضوع ہے۔ وہ ایک طرف تصوف یا روحانیت اور دوسری طرف عہد حاضر کے بدلتے سائنٹیفک رجحانات کی توجیہ و دلیل کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ کچھ اس طرح سے کہ حیات و ممات کی فلاسفی اور اس کی حقیقی روح کو سمجھنے کیلئے ان دونوں کی اکائی کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ افسانوی عناصر میں فلسفہ کی سنجیدگی و پیچیدگی کو جس خوبصورتی اور توازن کے ساتھ رشید امجد نے ضم کیا ہے۔ یہ اردو افسانے کی دنیا میں صرف انہی سے منسوب رہے گا۔ اور فلسفۂ زمان و مکان کو کہانی میں جسطرح سمویا گیا ہے۔ یہ کمالب ھیار دو افسانے کی تاریخ میں انہی سے وابستہ رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان عوامل نے اُردو افسانے میں ایک نئی فنی اور فکری جہت کو آغاز دیا ہے۔

رشید امجد کی کہانی اپنی طویل جدوجہد کے ساتھ اب شدید تنہائی کی اُداس سنسا ن راہداری سے گذر رہی ہے۔ وہ سرمئی دھند لاہٹ جو اُسے ہمیشہ پیش نظر رہی۔ وہ اب بھی کہانیوں میں موجود ---لیکن اب بے یقینی کا سفر کسی یقین کا عنوان پا رہا ہے۔ زندگی کی تمام سرگرمی اب کہانی لاؤنج میں سمیٹ لائی ہے۔ کھیت کھلیانوں، سڑکوں چوراہوں اور زندگی کے بطن سے موضوعات چنتے چنتے کہانی اپنی ذات کے حصار کو توڑتی دکھائی دیتی ہے۔ شاید زندگی اور تمام رشتوں کا تسلسل یہی ہے۔ جو بے نام دُکھوں سے عبارت ہے۔ اور یہ دکھ چڑیا کی اُڑان سے منسوب ہو کر اِسی تسلسل کا حصّہ بن جاتے ہیں شاید ان کہانیوں نے اپنا مجموعی نام بھی خود تجویز کیا ہے۔ کہ "دکھ ایک چڑیا ہے"۔

حوالہ جات:

۱۔ بوالخیر کشفی، ڈاکٹر رشید امجد ایک مطالعہ، ترتیب و تعارف، ڈاکٹر شفیق انجم، نقش گر، راولپنڈی، 2009 صفحہ، 142۔

۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2016، صفحہ، 10

۳۔ ایضاً، صفحہ، 12 ۴۔ ایضاً، ص، 18

۵۔ حسرت کاسگنجوی، رشید امجد۔ ایک مطالعہ، ترتیب و تعارف، ڈاکٹر شفیق انجم، نقش گر، راولپنڈی، 2009، ص، 149

۶۔ ناصر عباس نیر، فلیپ رشید امجد۔ ایک مطالعہ ترتیب و تعارف، ڈاکٹر شفیق انجم، نقش گر، راولپنڈی، 2009

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2016، ص، 22

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، فلیپ پسِ پشتِ نظر سے آگے، کلیات، مقبول اکیڈمی لاہور، 1991

۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2016، ص، 41

۱۰۔ ایضاً، ص، 89 ۱۱۔ ایضاً، ص، 36 ۱۲۔ ایضاً، ص، 52 ۱۳۔ ایضاً، ص، 40

۱۴۔ ایضاً، ص، 49 ۱۵۔ ایضاً، ص، 98 ۱۶۔ ایضاً، ص، 64

۱۷۔ ایضاً، ص، 135 ۱۸۔ ایضاً، ص، 49

۱۹۔ گوپی چند نارنگ، فلیپ رشید امجد ایک مطالعہ، ترتیب و تعارف ڈاکٹر شفیق انجم، نقش گر، راولپنڈی 2009ء

۲۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2016، ص، 48

۲۱۔ ایضاً، ص، 58

۲۲۔ مہدی جعفر، خط بنام رشید امجد، بھوپال، انڈیا، 1982

۲۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 2016 , ، ص، 94

۲۴۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، پیش لفظ، دُکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 2016ء

۲۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 2016ء، ص 221

۲۶۔ ایضاً ص، 38 ۲۷۔ ایضاً ص، 122 ۲۸۔ ایضاً ص، 122

۲۹۔ منشایاد، ایک عام آدمی کا خواب، مطبوعہ جدید، جرمنی، شمارہ، ۸

۳۰۔ رشید امجد سے گفتگو، انٹرویو، قراۃ العین طاہرہ، مشمولہ، ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، ص، 141

۳۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2016، ص، 37

۳۲۔ ایضاً ص، 37

۳۳۔ رشید امجد سے گفتگو، انٹرویو قرۃ العین طاہرہ، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، ص، 141

۳۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے۔ ص، 40

۳۵۔ ایضاً ص، 95 ۳۶۔ ایضاً ص، 45 ۳۷۔ ایضاً ص، 187 ۳۸۔ ایضاً ص، 193

۳۹۔ ایضاً ص، 188 ۴۰۔ ایضاً ص، 74 ۴۱۔ ایضاً ص، 74 ۴۲۔ ایضاً ص، 118

۴۳۔ ایضاً ص، 89 ۴۴۔ ایضاً ص، 98

۴۵۔ ابو الخیر کشفی، ڈاکٹر، مشمولہ رشید امجد ---ایک مطالعہ، ترتیب و تعارف، ڈاکٹر شفیق انجم، نقش گر، راولپنڈی، 2009، ص 141

۴۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دُکھ ایک چڑیا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 2016، ص 217

☆☆☆☆☆